انتظار حسین کا علامتی افسانہ ___ عصر حاضر کے سرمایہ دارانہ نظام کا نوحہ

عمارہ طارق

Abstract:

Intazar Hussain is considered an eminent short story writer among symbolic short story writers. He has extracted valuable symbols and metaphors from ancient stories, fables religious tradition and ancient mythological tales; he has elaborated destructive economic issues of present era, the tragedies of society, hollowness of humanity and moral and spiritual problems in a very effective way.Our external world of today is progressing rapidly for material prosperity. In this voyage a man of today has lost its true treasure of completion unconsciously. A man of present era is a victim of self deception and depression. Emotional and psychological issues, spiritual hollowness, external disintegration and confusion are growing and the basic reason of all these problems and tragedies is financial and social disorder. Capitalism has set such a state of greed, avarice and materialism that has effected the entire status of society on the whole.Intazar Hussain has disclosed these matters symbolically in his different short stories in very sublime way.

پاکستان میں ۱۹۵۸ء اور ۱۹۶۰ء کا دور اپنے اندر ایک منتشر صورت حال کے آثار سمیٹے نظر آتا ہے۔ یہ دور نہ صرف سیاسی، معاشی اور اقتصادی لحاظ سے انتشار کا شکار تھا بلکہ ادبی سطح پر بھی تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ جدید افسانہ نئی ہئیت اور نئی جہت کے ساتھ میدان ادب میں اتر چکا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ملکی سطح پر فکری و نظریاتی تصادم کی وجہ سے معاشرہ شکست و ریخت کا شکار ہو رہا تھا۔ جمہوری قدریں زوال پذیر تھیں۔ جس مقصد کی خاطر وطن حاصل کیا گیا وہ نظروں سے اوجھل تھا۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام نے مادیت پرستی کی ایسی فضا قائم کر دی تھی۔ جس

نے نئی نسل کو تباہی کے دہانے پر کھڑا کر دیا۔ اخلاقی اقدار، مذہب، رشتوں اور جذبوں پر سے لوگوں کا یقین و اعتماد ختم ہونے لگا۔ استحصالی قوتوں کے فروغ اور سرمایہ دارانہ جبریت نے معاشرے میں ایسی بدعنوانیاں پھیلا دیں کہ خیر، مثبت سوچ اور نیکی پسِ پشت چلی گئی۔ صنعتی ترقی نے مشینی حکومت قائم کر دی اور محنت کش عوام کا وجود مشینی پرزہ بن کر رہ گیا۔ سیاسی صورتحال اس سے بھی بدتر ہو گئی۔ فوجی آمریت، مارشل لاء اور ظلم و تشدد کی فضا نے ملکی امن وامان اور سکون و آشتی کو بے موت مار دیا اور اس کی جگہ خوف و وحشت، بے حسی اور فراریت کو جنم دیا۔ ان حالات میں ادیبوں، مصنفوں اور دانشوروں کی قلمی آزادی بھی سلب کر لی گئی۔ اب معاشرتی بدحالی اور ملکی بدنظمی کے خلاف ادیب کھلم کھلا اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ چناں چہ ادیب نے علامتوں کا سہارا لیا۔ یوں علامتی افسانہ وجود میں آیا۔ اگر چہ افسانے میں علامت نگاری کا رنگ پہلے بھی پایا جاتا تھا۔ مگر باقاعدہ ایک غالب رجحان کے علامت نگاری کا آغاز اسی دور میں ہوا۔ علامتی افسانے پر بے تحاشا تنقید بھی کی گئی۔ افسانے کا روایتی ڈھانچہ اور ہئیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی جس کے باعث نقادوں نے کافی تنقیدی آوازیں بلند کیں۔ جمیل جالبی صاحب نے علامتی افسانے کو منفی رجحان قرار دیا۔ اس کے برعکس انور سدید صاحب نے اس کاوش کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے اسے خواب اور علامت کے مماثل قرار دیا۔ فرمان فتح پوری نے اسے خیر اور سلامتی سے تعبیر کیا:

> ''کیا عجب کہ آج ہم نئے افسانے کے جس تجریدی اور علامتی رجحان کو مہمل اور علامتی کہہ رہے ہیں، وہی معنویت اور سلامتی کی راہ ہو۔ ماضی میں بھی بارہا ایسا ہوا ہے اور شاید آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔'' [۱]

میرا مقصد یہاں علامتی افسانے کی خوبیاں یا خامیاں گنوانا ہرگز نہیں اور نہ ہی ہمارا موضوع اس بات کی اجازت دیتا ہے۔ چناں چہ زیادہ تفصیل میں جانا ضروری نہیں۔ میرا مقصد ان علامتی افسانہ نگاروں کا جائزہ لینا ہے۔ جنھوں نے اپنے افسانوں میں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ معاشی نظاموں کی جبریت، استحصالی رنگ اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کو علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔

علامتی افسانہ نگاروں میں انتظار حسین (۱۹۲۵ء) صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ انتظار حسین ان چند افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اردو افسانے کو نئے فنی اور معنیاتی امکانات سے مالا مال کیا۔ انھوں نے جدید علامتی افسانے کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کی۔ انتظار حسین نے قدیم داستانوں، حکایتوں، مذہبی روایتوں، قدیم اساطیر اور دیومالائی کہانیوں سے نادر علامتیں اور استعارے اخذ کیے۔ جن کے ذریعے عصرِ حاضر کے تباہ کن معاشی مسائل، موجودہ معاشرے کے المیے، انسانیت کے کھوکھلے پن اور اخلاقی و روحانی مسائل کو منفرد انداز میں بیان کیا۔ انتظار حسین کے بارے میں عمومی رویہ یہی ہے کہ ان کے افسانوں کا بڑا حصہ یادوں سے آباد ہے۔ وہ قدیم تہذیبوں اور ماضی کی روایات میں گم اپنی تہذیبی شخصیت اور شناخت کے کھوئے جانے کا غم شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ انہیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ ان کی ذات کا کوئی حصہ کٹ کر ماضی میں رہ گیا ہے وہ حال میں زندہ ہوتے ہوئے بھی ماضی میں سانس لے رہے ہیں۔ ماضی کی بازیافت اور گمشدہ روایات کی

تلاش ان کے بنیادی موضوعات ہیں۔ ہجرت کا تجربہ بھی ایک موضوع کی صورت میں ان کے افسانوں کی پہچان بن چکا ہے۔ یہ موضوعات انتظار حسین کے ابتدائی مجموعوں ''گلی کوچے'' اور ''کنکری'' میں واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ کے بقول یہ مجموعے ان کے افسانوں کے ابتدائی دور کو واضح کرتے ہیں۔ جبکہ ان کے افسانوں کا دوسرا دور ''آخری آدمی'' سے شروع ہوتا ہے۔ یہ دور ان کے افسانوں کا ایک نیا موڑ ہے۔

ہماری آج کی خارج کی دنیا مادی ترقی کی منازل نہایت تیز رفتاری سے طے کر رہی ہے۔اس سفر میں آج کے انسان نے اپنے داخل کا کل خزانہ اور زادِ راہ غیر محسوس طریقے سے کھو دیا ہے۔آج کا سماج اور فرد اخلاقی و روحانی طور پر زوال پذیر ہو چکا ہے۔ عصرِ حاضر کا انسان آشوب ذات اور کرب کا شکار ہے۔ جذباتی و نفسیاتی مسائل، روحانی تشنگی، بے چارگی، داخلی انتشار اور الجھنیں بڑھتی ہی چلی جا رہی ہیں۔ ان تمام مسائل اور المیوں کی بنیادی وجہ اقتصادی و معاشی بدنظمی و بدحالی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے مادیت پرستی اور حرص و ہوس کی ایک ایسی فضا قائم کر دی ہے۔ جس نے براہ راست معاشرے کی اجتماعی صورتحال کو متاثر کیا ہے۔ فرد کی روحانی اور اخلاقی شکستگی سے معاشرہ انحطاط کا شکار ہو گیا ہے۔ انتظار حسین نے ان مسائل کو علامتی انداز میں اپنے افسانوی مجموعے ''آخری آدمی'' میں نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے۔

گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> ''اخلاقی اقدار کی شکست اور اجتماعی اطمینان کے فقدان کا نتیجہ ایسا نفسی انتشار ہے کہ انسان بحیثیت انسان اپنی جون کو بھر برقرار نہیں رکھ پا رہا۔ انتظار حسین کے مجموعے ''آخری آدمی'' کی جو ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ زیادہ تر کہانیاں اسی احساس کی ترجمان ہیں۔'' [۲]

''آخری آدمی'' افسانہ میں انتظار حسین نے قرآن پاک کی سورہ بقرہ کے ایک تاریخی واقعہ کو بنیاد بنا کر عہد جدید کی مادیت اور سرمایہ پرستی کی منفی صورتحال کو علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔ بنی اسرائیل کی وہ قوم جس نے احکامِ الٰہی کو پسِ پشت ڈال کر حرص و ہوس اور مادی منفعت کو اپنی ترجیح بنایا اسی قوم کو خدا نے سرکشی کے باعث بندر ذلیل بنا دیا۔ واقعہ سبت کو پیش کر کے دراصل انتظار حسین نے آج کے انسان کے لالچ اور فریب کا پردہ چاک کیا ہے، جو سرمایہ پرستی اور دولت کی اندھا دھند دوڑ میں اخلاقیات، خیر و بھلائی، احکام الٰہی، روحانی و ذہنی پاکیزگی اور معاشرتی رشتوں کو پامال کرتا چلا جا رہا ہے۔ المیہ تو یہ ہے کہ سرمایہ پرستی کے جنون میں انسان اپنی جون، رتبہ اور مقام تک بھول گیا ہے۔ وہ بلند مرتبے اور اعلیٰ مقام سے پستی اور ذلت کا شکار ہو چکا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ''الیاسف'' دانشمند اور صاحبِ شعور ہے۔ وہ احکامِ الٰہی کا پابند اور اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کا ادراک رکھتا ہے وہ اس وعدے پر مضبوطی سے جما ہے کہ لالچ اور حرص سے مغلوب ہو کر قبیلے کے دوسرے افراد کی مانند وہ انسان سے بندر نہ بنے گا۔ مگر آخر مکر و فریب، حیلے اور خود فریبی کے ہاتھوں شکست کھا کر لالچ و حرص اور مادیت پرستی کا شکار ہو کر بندر بن جانے والا آخری آدمی قرار پاتا ہے۔ انتظار حسین نے یہ واقعہ علامتی رنگ میں بیان کر کے عصرِ حاضر کے سرمایہ دار انہ المیے کو تاریخی انداز میں پیش کیا ہے۔ آج کا انسان مادیت کے حصول میں اس بری طرح سے سرگرداں ہے کہ وہ

انسانیت کی معراج کو بھول کر حیوانی سطح پر اتر آیا ہے۔ یوں یہ افسانہ موجودہ دور کے معاشی نظام کا نوحہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد کامران لکھتے ہیں:

''انتظار حسین نے مذکورہ واقع کی روشنی میں افسانے کا تانا بانا تیار کرتے ہوئے اسے جدید دور کے مادیت پرست طبقے پر منطبق کر دیا ہے۔ زر کی ہوس نے جس طرح آدمی سے اس کی آدمیت چھین کر اسے اعلیٰ اخلاقی قدروں سے محروم کر دیا ہے۔ اور جس طرح اس کی جون تبدیل کر دی ہے اس کے تناظر میں مذکورہ افسانہ کسی خاص عہد یا معاشرت تک محدود نہیں رہتا بلکہ آفاقیت کا حامل ہو جاتا ہے۔'' [۳]

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی بھی افسانے میں لالچ اور ہوس کاری کو داخلی طور پر روحانی زوال اور معاشرتی رشتوں کی شکست قرار دیتے ہیں۔قریب قریب اسی موضوع پر انتظار حسین کا ایک اور شاہکار افسانہ ''زرد کتا'' ہے۔ انتظار حسین نے افسانے میں صوفیاء کے قدیم تذکروں اور ملفوظاتی اسلوب میں قدیم قصوں اور معجزات سے علامتیں اور استعارے لے کر نفسانی، جنسی اور مادی قوتوں کی تسخیرانہ طاقت کو واضح کیا ہے۔ آج کے اس پر آشوب سرمایہ دارانہ نظام میں انسان اعلیٰ اخلاقی قدروں کو چھوڑ کر مادی طاقتوں کے سامنے ہتھیار ڈالے کھڑا ہے۔ اعلیٰ اقتدار، دولت اور قوت کا حصول اس قدر مضبوطی سے جڑ پکڑ چکا ہے کہ نیکی کی راہ پر چلنا اور اپنے نفس کو مارنا ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ کتا، زرد رنگ اور لومڑی کا بچہ نفس کی علامتوں کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔جس پر قابو پانا آج کے فرد کے بس سے باہر ہے۔ شیخ کبوتر کی تعلیمات کا بنیادی موضوع لالچ اور حرص ،نفس پرستی ، مادیت پرستی اور دنیاوی الائشوں سے بچنا ہے۔ انتظار حسین نے شیخ کی تعلیمات میں سرمایہ دارانہ نظام کی تمام منفی خصوصیات کو ایک منفرد انداز میں پیش کیا ہے:

''عرض کیا: طمع دنیا میں کب پیدا ہوتی ہے؟

فرمایا: جب علم گھٹ جائے۔

عرض کیا: علم کب گھٹتا ہے؟

فرمایا: جب درویش سوال کرے، شاعر غرض رکھے، دیوانہ ہوش مند ہو جائے ، عالم تاجر بن جائے ، دانشمند منافع کمائے۔'' [۴]

اگر غور کیا جائے تو دراصل ان تمام رموز میں عصرِ حاضر کی مادیت پرستی کے ان قبیح پہلوؤں کو بیان کیا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کا عطیہ ہے۔ شیخ کبوتر کے مریدوں کا دولت و آسائش پر نفس کشی اور فقر کو قربان کر دینا، بڑے بڑے محلوں اور حویلیوں کو خاک نشینی پر ترجیح دینا، ٹھنڈے پانی اور بھوک کی جگہ دسترخوان کے لذیذ کھانوں پر مرمٹنا اور ٹاٹ کی جگہ ریشم و کمخواب کی پوشاکوں کو اوڑھ لینا دراصل آج کے انسان کی نفسانی خواہشات کے غلبے اور سرمایہ دارانہ نظام کے اس مضبوط حصار کی گواہی دے رہا ہے جس کی گرفت میں آج کا معاشرہ جکڑا جا چکا ہے۔ علم،

معرفت، اخلاقی قدریں اور خیر کے جذبات سب ثانوی ہو چکے ہیں۔ اور ہر جگہ ایک بہت بڑا زرد کتا اپنی بھر پور طاقت کے ساتھ بیٹھا مسلسل بڑھوتری کے عمل سے گزر رہا ہے۔ انتظار حسین کا یہ افسانہ سرمایہ پرستی کے اس دور میں معاشرتی انحطاط و زوال کے ساتھ ساتھ اخلاقی قدروں کے فقدان اور روحانی المیے کو بیان کر رہا ہے۔ انھوں نے اس بنیادی نکتے کو منفرد علامتوں کے اظہار سے پیش کیا کہ مادیت پرست، حرص، طمع اور لالچ کا فروغ ہی دراصل معاشرے کی پستی کا سبب بنتا ہے۔ اسی مجموعے کے ایک اور افسانے ''ہڈیوں کا ڈھانچ'' میں بھی عصرِ حاضر کے انسان کے اخلاقی و روحانی زوال کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ انتظار حسین نے بھوک کی علامت کو انسان کے داخل کی ہوس اور حرص کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ پیٹ کی بھوک ایک ایسا عفریت اور بد روح ہے جو انسان کے اندر سے خیر کے جذبات، مثبت افکار و خیالات، حلال وحرام کی پہچان اور اخلاقیات سب کو نگل جاتا ہے۔ آج کے معاشی استحصالی دور میں یہ بھوک مختلف صورتوں اور مختلف حالات میں مختلف طبقات پر الگ الگ اثرات مرتب کرتی اور نئی نئی شکلوں میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ انتظار حسین نے روایتی اور داستانوی انداز میں قحط میں مر جانے والے ایک شخص، جو ہڈیوں کا ڈھانچ ہے۔ اس کے دوبارہ جی اٹھنے اور حیوانی انداز میں صدیوں کی بھوک مٹانے کی کہانی کو بیان کیا ہے۔ اس شخص کو ہر روز پہلے سے زیادہ بھوک محسوس ہوتی ہے۔ بے تحاشہ کھانے کی وجہ سے صورتِ حال یہ ہو جاتی ہے کہ گھروں سے کھانا کم پڑنے لگتا ہے۔ لوگ بھوکے رہنے لگتے ہیں یہاں تک کہ قحط کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر ایک روز ایک عامل نعرہ تکبیر بلند کر کے اس ہڈیوں کے ڈھانچ میں بسی بد روح کو نکال دیتا ہے اور وہ شخص دوبارہ مر جاتا ہے۔

اس کے بعد افسانہ نگار اس سانپ کا قصہ سناتے ہیں جو بھوک میں سانپ، چھپکلی اور بچھو بھی کھا جاتا ہے۔ یوں کہانی در کہانی کا سلسلہ انتظار حسین کے کہانی پن کو ظاہر کرتا ہوا نئی سے نئی حقیقتوں کو منکشف کرتا چلا جاتا ہے۔ ان مختلف علامتوں، حکایتوں اور کہانیوں کے ذریعے انتظار حسین دراصل جدید دور کے معاشی المیے کو بیان کر رہے ہیں۔ سرمایہ دارانہ استحصالی نظام نے غربت و مفلسی کی بھوک کے ساتھ انسان کے داخل میں مادیت پرستی اور حرص و ہوس کی ایک ایسی فضا پیدا کر دی ہے جس نے اس کی آنکھوں اور دل کی اصل روشنی کو ختم کر کے نفسانی خواہشات کو بیدار کر دیا ہے۔ آج کا فرد حلال وحرام اور خیر وشر کی پہچان بھول کر حیوانی سطح پر اتر آیا ہے۔ افسانہ نگار کو ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے تمام لوگ انسان نما حیوان محسوس ہوتے ہیں۔ جن کے چہرے لمبے ہوتے جا رہے ہیں اور جبڑے کھلتے جاتے ہیں۔ ایک میز پر ملگجی داڑھی والا شخص جب قحط زدوں کی طرح کھانے پر جھپٹتا ہے اور مسلسل کھاتا ہی چلا جاتا ہے تب افسانہ نگار کو محسوس ہوتا ہے جیسے یہ بوڑھا شخص، ہڈیوں کا ڈھانچ اور وہ خود سب ایک ہی تصویر کے رخ ہے۔ ہڈیوں کا ڈھانچ کوئی بد روح نہیں بلکہ وہ خود ہے جس کے اندر بھوک ہی بھوک ہے۔ اس کی ٹانگیں لمبی اور جبڑے کھلتے جا رہے ہیں۔ یہ بھوک آج کے سرمایہ پرست معاشرے میں ہر فرد کے اندر پیدا ہو چکی ہے اور لالچ اور حرص اس بھوک کو بڑھاتے چلے جا رہے ہیں۔

افسانہ ''ہمسفر'' بھی انتظار حسین کا قابل ذکر افسانہ ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے معاشی استحصال،

مایوسی و ناامیدی، بیروزگاری ، نوجوان نسل کی باغیانہ سوچ، بے سمتی اور بے چارگی جیسے مسائل کو بیان کیا ہے۔کسی بھی ملک کی خوشحالی اور مضبوطی کا تعلق معاشی نظام کی مضبوطی سے ہوتا ہے۔اگر لوگ معاشی و اقتصادی طور پر خوشحال ہوں گے تو اخلاقی و روحانی لحاظ سے بھی مثبت سوچ کے مالک ہوں گے۔مگر اگر روزگار اور زندگی کی بنیادی ضروریات کی محرومی ہوگی تو اخلاقی زوال کا شکار ہونا لازمی بات ہے۔اسی بنیادی موضوع کو انتظار حسین نے اس افسانے میں علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔غلط بس میں سوار ہو جانے والا تعلیم یافتہ نوجوان اپنی بے روزگاری کے ہاتھوں مایوس و ناامید ہے۔ یہ ناامیدی اس پر جھنجھلاہٹ کی صورت میں طاری ہوتی ہے۔بس میں سوار لوگوں کی بدحالی،غربت اور معاشی ابتری اس پر باغیانہ حملہ کرتی ہے وہ اپنے ان دوستوں کو یاد کرتا ہے جو تعلیمی قابلیت میں اس سے کہیں کم تھے مگر آج وہ بیرون ملک جا کر پیسہ کما رہے ہیں جبکہ وہ بے روزگاری کا تمغہ سجائے بسوں میں دھکے کھا رہا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اس کے دوستوں نے بہتر فیصلہ کیا۔اس ملک میں رہنا تو زندگی خراب کرنے کے مترادف ہے۔انتظار حسین نے غیر منصفانہ معاشی نظام اور سرمایہ دارانہ نظام کی پیدا کردہ طبقاتی کشمکش اور مایوسی و ناامیدی کا اظہار کیا ہے جس کا شکار ملک کا غریب اور تعلیم یافتہ متوسط طبقہ ہو رہا ہے۔جن مقاصد کی خاطر یہ وطن حاصل کیا گیا وہ مقاصد استحصالی قوتوں کے مفادات میں کچلے گئے اور آج صورتحال قابل تشویش ہو چکی ہے۔غلط بس کی سواری اور اس بس کے اندر سوار مختلف لوگوں کی تصویرکشی دراصل اسی غلط راستے کی علامت ہے جس پر لوگ سفر کرتے چلے جا رہے ہیں مگر منزل کا کہیں نشان نہیں ہے۔غیر منصفانہ معاشی نظام اور غیر اطمینان بخش صورتحال نے آج کی نوجوان نسل میں مایوسی و ناامیدی کے ساتھ ساتھ اخلاقی زوال اور وطن سے بیزاری کے منفی رجحانات پیدا کر دیئے ہیں:

> ''اسے اس وقت خالد،نعیم بتھر، شریف کالیا ایک احساس رشک کے ساتھ یاد آئے۔ یہ سب اس کے ساتھ ہی سپیشل ٹرین میں سوار ہوئے تھے۔ایک ہی طرح کے خوف سے گزر کر ایک ہی حال میں وہ پاکستان پہنچے تھے اور اب ان کے راستے کتنے الگ الگ تھے اور اسے اپنا احوال اس ٹوٹی پھوٹی بس کا سا محسوس ہوا جو رینگتی رینگتی بیچ راستے میں کہیں کھڑی ہو جائے۔'' ۵

بلراج کومل اس افسانے کو سرمایہ دارانہ صنعتی ترقی میں مسخ ہوتی انسانیت کا المیہ سمجھتے ہیں ان کے خیال میں ہمسفر کا Locale ایک بڑا شہر ہے۔ پاکستان کا بڑا شہر جس کا چہرہ صنعتی ترقی نے بدل کر رکھ دیا ہے۔ترقی اور اس کے ارتقاء نے نہ صرف فطرت کا چہرہ بدل دیا ہے بلکہ انسانوں کے چہرے بھی مسخ کر دیئے ہیں سب لوگ جلد از جلد منزل مقصود تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ نہ انہیں بس کی ساخت سے دلچسپی ہے نہ اس کو چلانے والے ڈرائیوار سے نہ مسافروں کی نجی تکلیفات سے، نہ وہ ہمدردی سے واقف ہیں نہ حقیقی بے اعتنائی سے، وہ محض تفریح، مستی بے معنی، خالی وقت کو پر کرنے والی تفریح سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ۶

اخلاقی زوال اور لالچ و فریب کی اصل صورت اس وقت واضح ہوتی ہے جب اپنی مفلسی اور بے روزگاری کے ہاتھوں بس میں ٹکٹ چیکر کو دھوکا دینے کا خیال دل میں لاتا ہے۔وہ سوچتا ہے کہ اگر وہ ٹکٹ کے سات پیسے بچا

لے تو اس کے کئی رکے کام ہو سکتے ہیں۔ لالچ اور مزاحمت اس کے اندر ایک اخلاقی آویزش کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ رات کے بڑھتے سائے، گہری ہوتی تاریکی، منزل کی عدم شناخت، غلط راستے کا خوف، خالی ہوتی بس اور گمشدہ راستوں جیسی علامات سے عصرِ حاضر کے اقتصادی بحران اور معاشرے کی مجموعی صورت حال کی عکاسی نہایت عمدگی سے کی گئی ہے۔ بس کے سفر میں مسلسل سویا رہنے والا شخص دراصل بے حسی اور بے بسی کی علامت ہے۔ سرمایہ دارانہ استحصالی نظام اور معاشی جبریت کا شکار غربت طبقہ اپنے حال سے آنکھیں چرانے اور غفلت کی نیند سونے میں عافیت محسوس کر رہا ہے۔

''دوسرا گناہ'' افسانہ ایک تمثیلی افسانہ ہے۔ جس میں انتظار حسین نے کمال فنکارانہ مہارت سے حاکم طبقے کی استحصالی قوت، غیر منصفانہ اقتصادی نظام اور طبقاتی کشمکش پر اظہار خیال کیا ہے۔

ڈاکٹر قاضی عابد کہتے ہیں۔

> ''دوسرا گناہ'' زرد کتا کی معنوی توسیع ہے، جب انسان فقر اور قناعت کو چھوڑ کر دنیا کی طرف لپکتا ہے تو سگِ دنیا بن کر رہ جاتا ہے۔'' ۷

انتظار حسین نے زمران بادشاہ کی تمثیلی کہانی کے ذریعے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ جب حاکم غیر منصف ہو جائے۔ اپنے لیے بہتر اور عوام کے لیے گھٹیا چیز کا انتخاب کرے، غیر منصفانہ معاشی نظام کارفرما ہو جائے، تب گوشت ناخن سے جدا ہو جاتا ہے، رشتے، جذبے، مثبت اقدار اور اخلاقیات سب زوال پذیر ہو جاتے ہیں۔ یہ افسانہ بہت حد تک ترقی پسند نظریات کا حامل ہے اور سرمایہ دارانہ نظام پر کاری ضرب ہے۔ یہ انتظار حسین کا ایسا افسانہ ہے جس میں ہوسِ زر، نام نمود اور مادی سہولت کی آرزو اور وسائل پر اجارے کی تمنا کی کوکھ سے جنم لینے والے طبقاتی امتیاز کو ''ترقی پسندانہ'' کرب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ۸

آج کے دور میں سرمایہ دارانہ نظام نے مادیت پرستی، حرص و ہوس، طبقاتی کشمکش اور اخلاقی زوال جیسے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ یہ افسانہ ان موضوعات کی صحیح معنوں میں عکاسی کرتا ہے۔ آٹے کا پسنا، باریک اور اچھا آٹا بادشاہ کیلیے مخصوص ہونا، بھوسی اور بے چھنا آٹا عوام کی خوراک بننا، گھروں میں دیواروں کا کھڑے ہو جانا، اونچے طبقے کے لیے بڑی دیواریں، مضبوط دروازے اور پہرے داروں کا متعین ہونا، امراء کے لیے شاہراہوں کا بننا، غرباء کیلیے زمین کا تنگ ہو جانا، حکمران کے پالتو جانوروں کا عمدہ خوراک کھانا اور غریب کو جو کی روٹی بھی نہ ملنا ان سب علامتوں اور تمثیلوں سے انتظار حسین نے موجودہ دور کی اقتصادی بدنظمی، استحصالی قوتوں کے غلبے اور طبقاتی کشمکش کو واضح کیا ہے۔ زمران کے ظلم وستم سے تنگ غریب لوگوں کا بستی کو چھوڑ کر نئی بستی بسانا، عمر رسیدہ بزرگ کا منصفی بننا اور آٹے کی چھلنی کا دوبارہ سے بستی میں آ جانا اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے۔ کہ طبقاتی کشاکش اور معاشی استحصال کا چکر پھر سے شروع ہو جائے گا۔ شہر اور بستیاں بدلنے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا جب تک معاشی انصاف اور اقتصادی مساوات کو اپنایا نہیں جائے گا۔ سرمایہ دارانہ استحصال پر غلبہ نہیں پایا جائے گا۔ تب تک یہ کہانی یونہی دہرائی جاتی رہے گی۔ مصنف نے الیملک، حشام اور زمران کے کرداروں کے التباس میں عدل و انصاف کی

قوت اور حکمران طبقوں کی ہوسِ اقتدار کے درمیان جدل کی کیفیات کے بیچ فقر کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ۹

سرمایہ دارانہ جبریت اور طاقتور طبقے کی غاصبانہ قوت سے پیدا شدہ تباہی کی عکاسی انتظار حسین نے یوں کی۔

''دیوار سے گر کر مر جانا اس سے چھا ہے کہ آدمی فاقے کر کے مرے، کھیت شاہراہوں اور اصطبلوں کی زد میں آ گئے، کھیتوں والے کچھ نگہبان ہے کچھ سائیں ہوئے، کچھ آوارہ ہو گئے اور گیہوں ہمارے درمیان تھوڑا رہ گیا اور گراں ہوگیا اور ہم نے اس بستی کی زمین کو اپنے آپ پر تنگ پایا تو نکل کھڑے ہوئے۔'' ۱۰

عصرِ حاضر میں استحصال کی یہ کہانی عام ہے اور نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔

''وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے'' افسانہ بھی تمثیلی پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے انتظار حسین نے یاجوج ماجوج کی علامت سے دو ملک یا دو معاشروں کی تصویر کشی کی ہو جو سد سکندری کو ختم کرنے کی ناممکن کوشش میں مصروف ہیں مگر جس کا کوئی حاصل نہیں۔ گوپی چند نارنگ کے خیال میں غریب، افلاس، جہالت، مغربی طاقتوں کا استحصال اور استعماریت ابھرتے ہوئے معاشروں کیلیے سد سکندری کی طرح ہے جسے مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے مگر یہ مسائل ختم نہیں ہو پا رہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اور غیر منصفانہ اقتصادی نظام مغربی طاقتوں کا پھیلایا ہوا ایسا جال ہے جس کی گرفت میں ہمارا معاشرہ اور دیگر کئی ممالک بری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔ سدِ سکندری اس نظام کی علامت ہوسکتی ہے جس کو مٹانے کی کوشش بے سود ہوتی جا رہی ہے۔ یہ جال اتنا مضبوط ہے کہ اس کو کاٹنے والے ایک دوسرے کا بازو بننے کے بجائے آپس میں دست و گریباں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔

انتظار حسین نے بوڑھے دانشمند کے ان الفاظ سے گویا اپنے داخل کے دکھ کا اظہار کیا ہے۔

''یافث کی اولاد دومنھواں سانپ بن گئی کہ خود ہی کو ڈس رہی ہے۔'' ۱۱

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انتظار حسین ایسے قابل افسانہ نگار ہیں جنھوں نے تاریخی کہانیوں، قصوں، قرآنی واقعات، تمثیلوں اور علامتوں کے نادر استعمال سے سرمایہ دارانہ نظام، معاشی جبریت اور غیر منصفانہ اقتصادی نظام کے نتیجے میں پیدا ہونے والی طبقاتی کشمکش، داخلی و خارجی انتشار، حرص و ہوس، لالچ وفریب اور روحانی و اخلاقی زوال کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

حواشی:

۱۔ فرمان فتح پوری، اردو کا افسانوی ادب، عالمین پبلی کیشنز پریس لاہور۔ ۱۹۸۸ء صفحہ ۱۴۸۔

۲۔ گوپی چند نارنگ، اردو افسانہ روایت و مسائل، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ ۱۹۸۶ء صفحہ ۵۲۸۔

۳۔ محمد کامران ڈاکٹر، میرا من سے انتظار حسین تک، ماورا پبلشرز لاہور۔ ۲۰۰۶ء صفحہ ۱۱۵۔

۴۔ انتظار حسین، **مجموعہ انتظار حسین**، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ ۲۰۰۷ء صفحہ ۳۸۵۔

۵۔ ایضاً صفحہ ۵۱۴

۶۔ بلراج کومل، ہم سفر، ایک تجزیہ، مشمولہ **انتظار حسین ایک دبستان**، ارتضیٰ کریم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۴ء صفحہ ۵۳۷۔

۷۔ قاضی عابد، ڈاکٹر، **اردو افسانہ اور اساطیر**، مجلس ترقی ادب لاہور۔ ۲۰۰۹ء صفحہ ۱۸۰

۸۔ انوار احمد ڈاکٹر، مشمولہ صفحہ ۱۸۰۔۱۸۱

۹۔ قاضی عابد، ڈاکٹر، **اردو افسانہ اور اساطیر** صفحہ ۱۸۰

۱۰۔ انتظار حسین، **مجموعہ انتظار حسین**۔ صفحہ ۵۶۶

۱۱۔ ایضاً صفحہ ۵۹۸